

ناولٹ

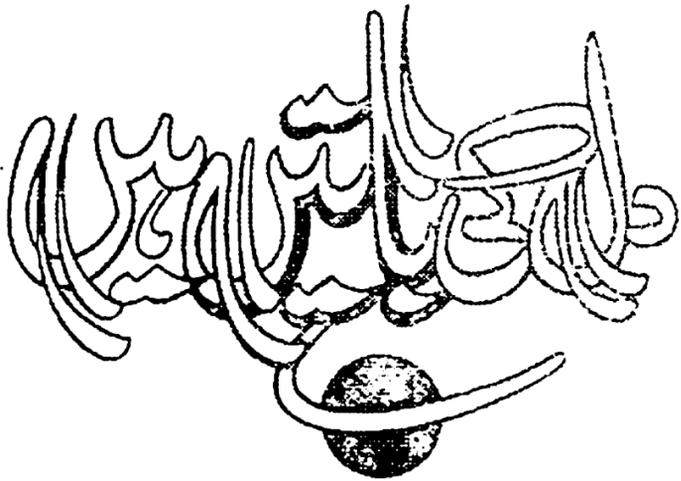
اٹھ اٹھ کے تمہیں تنگ کر رہے ہیں۔ دراصل بی بی میہا! آپ کو پڑگئی ہے عادت بلاوجہ دوسروں پہ الزام دھرنے کی۔“

رامش تکیے کو حسب عادت دوہرا کر کے کہنی کے نیچے رکھتے ہوئے شاید اس سے بھی لمبی بات کرتا مگر میہانے بھنا کے اس کے نیچے سے تکیہ گھسیٹ لیا۔
”سب سے پہلی بات تو یہ کہ اللہ کے واسطے تکیوں

”بچے بہت تنگ کر رہے ہیں رامش!“ وہ ہاتھوں پہ کریم ملتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”لگتا ہے یہ تمہارا تکیہ کلام بن چکا ہے۔ دن میں ستر ہزار بار دہرانے کے بعد اب اس وقت بھی یہی رونا رو رہی ہو جب کہ تینوں بچوں کو سوئے ہوئے بھی دو گھنٹے سے زیادہ ہو رہے ہیں۔ سوتے بھی وہ دوسرے کمرے میں ہیں ورنہ شاید میں سمجھتا کہ وہ سوتے میں

فاتحہ (فوتخار)



کو اس طرح خوار کرنا چھوڑ دو۔ دوسری بات یہ کہ میرے نام کے آگے لی بی نہ لگایا کرو اور تیسری بات یہ کہ خود تو اتنی لمبی لمبی چھوڑتے ہو، کبھی ذرا رک کے اگلے کی بھی پوری بات سن لیا کرو۔“

”سناؤ!“ وہ کہنی سہلاتے ہوئے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے لگا۔

”میں یہ کہہ رہی تھی کہ بچے آج کل بہت تنگ کر رہے ہیں اور وہ۔۔۔“

”جھوٹ۔۔۔ سراسر جھوٹ۔“ رامش نے بلبلا کر اس کی بات کاٹی۔ ”تم نے ”آج کل“ کا لفظ بالکل استعمال نہیں کیا تھا۔“

”خدا یا! رامش! تم کس قدر خبیثی ہو گئے ہو۔ ابھی عمر کے بیسیوں سال میں داخل ہونے میں بھی دو سال باقی ہیں مگر باتیں تم سٹھیائے ہوئے جیسی کرنے لگے ہو۔ ذرا جو سکون سے کسی کی بات سن لو۔ ایک



چھوٹی سی روزمرہ کی بات تھی جو میں کرنے والی تھی، جسے تم نے اپنی بے کار کی بحث میں چیونگم کی طرح کھینچ ڈالا ہے۔ میں صرف اتنا کہہ رہی تھی کہ بچے ضد کر رہے ہیں۔“

”دیکھا، دیکھا تم نے۔ پھر ایک بار اپنا بیان بدل ڈالا ہے۔ لی بی میہا! تم نے تو اچھے بھلے خاندانی اور جدی پشتی سیاستدانوں کو مات دے ڈالی ہے، لوٹا سازی کے فن میں۔“

”تم سے تو بات کرنا فضول ہے۔ انسان اس سے بھی دل کی بات نہ کہہ سکے جس سے عمر بھر کا واسطہ ہو تو۔۔۔ تو۔۔۔ اس کی آواز بھرا گئی اور وہ اپنا شدت غم سے بھرپور جذباتی ڈائیلاگ پورا نہ کر سکی۔ یہ اس کا کمزور ترین پہلو تھا۔ رونا بہت جلدی آجاتا تھا۔ اب بھی وہ آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو لیے تکیے پر سر رکھ کر رامش سے منہ موڑ کے لیٹ گئی۔

رامش نے ایک نظر وال کلاک پر ڈالی۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ گرمیوں میں تو یوں چھی سوتے سوتے اتنا وقت ہو ہی جاتا تھا۔ اگر کہیں باہر سے واپسی ہوئی ہو، کوئی مہمان آیا ہو یا ویل اینڈ ہو تب تو ڈیڑھ دو بج بج جایا کرتے۔ لیکن آج وہ مزید پانچ منٹ بھی جاگنے کے موڈ میں نہ تھا۔ سارا دن آفس میں سرکھپانے کے بعد اور طویل راستے تک ٹریفک کی خواری، جون کے مہینے کی تباہ کن گرمی، جھیل لینے کے بعد کمرے کے ایسے سی کی خنک فضا خواہ مخواہ خمار طاری کیے دے رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں وہ ایک بھرپور اور پرسکون نیند کے مزے لینا چاہ رہا تھا۔

”اس وقت اسے منانے کی کارروائی شروع کی تو اگلے بیس پچیس منٹ تو کہیں نہیں گئے۔ صبح سہی۔“

وہ یہ سوچتے ہوئے بسی تان کر سونا چاہتا تھا مگر ایسا کر نہ سکا۔

(صبح یعنی کہ صبح وہی بھاگم دوڑ، افراتفری والی صبح۔ ٹھنڈے ٹھنڈے گھر سے باہر نکل کر اپنا آپ سڑکوں کی بھٹی میں جھونکنے کا تصور ویسے ہی چرچرا

کر دیتا ہے۔ اوپر سے چھٹیوں کی وجہ سے بچے بھی کمرے ہوتے ہیں، ان کا ناشتہ بھی دیر سے یعنی میرے ساتھ بنتا ہے، جس کی وجہ سے میہا بھی الجھی ہوتی ہے۔ یہ منانے والا کام تو صبح ہرگز نہیں ہو سکتا۔ البتہ بغیر کسی وجہ کے لڑنے کا موقع ضرور نکل آتا ہے۔ یوں بھی ناراضی میں یہ ناشتہ بھی انتہائی بے ڈھنگا دیتی ہے۔ شام کو تھکا ہارا گھر لوٹوں تو پھر سے یہ سوچا ہوا منہ نہ بھٹی، جو کام آج بیس منٹ میں زبانی کلامی منٹ سکتا ہے اسے اپنی سستی کے ہاتھوں کیوں دو ڈھالی گھنٹے کے رد گرام میں بدلوں۔ ابھی تو سستی میں چھوٹ جاؤں گا، شام کو نخرے دکھاتے ہوئے لی بی کو ہری ہری سوچھے گی، لازماً ”ڈنریا آؤٹنگ کی فرمائش کی جائے گی۔“ اس نے خود پہ غلبہ پانی غنودگی اور سستی کو بمشکل دھکیلا۔

”میہا!“

صبح ہونے والی متوقع بد مزگی سے بچنے کے لیے اس نے لہجے میں کمال درجہ کی شیرینی گھول کے اس کے شانے پہ ہاتھ دھرا، جسے میہا نے جھٹک دیا۔ رامش نے دانت کچکچا کر اس کی پشت کو گھورا، گھنے بالوں کا کچھ الجھا، کچھ سلجھا جوڑا پوری شدت سے پکڑ کر ہلانے کو جی چاہا۔ دل کی اس خواہش کو مصلحت کے ہاتھوں دباتے ہوئے اس نے میہا کے کان کے پاس جھولتی لٹ کو بڑے پیار سے اپنی انگلی پہ لیٹا۔

”تم یوں روٹھو گی تو کیا میں سویاؤں گا؟“

(سر پہ آنے والے بھیانک گل کی تلوار لٹک رہی ہو تو کوئی کیا خاک سوئے۔ اب چھوڑ بھی نخرے۔) جواب ندارد۔ مگر اس بار ہاتھ جھٹکنے سے پرہیز کیا گیا تھا جس سے رامش کا حوصلہ برہما۔

”پلیزیانس۔ ذرا اسی بات کو سیریس نہ لیا کرو۔“

(بندے کو ذرا تو کھل کے سانس لینے دو، ہر بات میں اپنی خفگی کا ہوا کھڑا کیے رکھتی ہو۔ اب انسان کیا منہ بھٹی نہ کھولے۔)

”اچھا چلو پرامس! اب کبھی تمہاری بات نہیں کاٹوں گا۔“

(ہاں کہیں کی راجکماری ہو نا تم۔۔۔ توبہ کیا کیا کرنا پڑتا ہے ایک مشرقی مرد کو ذرا سے گھریلو سکون کے لیے)

اس کے لہجے سے گویا شہد ٹپک رہا تھا، پیار امانڈ رہا تھا مگر آنکھوں میں زمانے بھر کی بے زاری تھی وہ اسے تک رہا تھا کہ کب وہ رخ موڑ کے اس ناراضی کے خاتمے کا اعلان کرتی ہے اور وہ ہلکا ہلکا ہو کر سوتا ہے۔
”پلیز جان!“ اس نے انگلی پہ لٹینی لٹ کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔

(جی تو چاہ رہا ہے اکھاڑ ہی پھینکوں۔ ایک بچنے والا ہے اور ادھر نخرے ہی ختم نہیں ہو رہے۔)
اسی پھولے پھولے منہ کے ساتھ بالآخر مہمانانے رخ بدلا تو کمال مہارت کے ساتھ رامش کے لہجے کی مٹھاس اس کی آنکھوں میں بھی اتر آئی مگر وہ اس فن کا نظارہ اس طرح نہ کر سکی کہ اب سیدھی لٹینی ہلکی اسپید میں چلتے پھرتے نظر میں جمائے ہوئے تھی۔

”تم ہمیشہ ایسا کرتے ہو۔ میں جب بھی کوئی مسئلہ ڈسکس کرنا چاہوں، کوئی پر اہلم شیئر کرنا چاہوں، ہمیشہ بات کو مذاق میں اڑا دیتے ہو۔“ بالآخر اس کے لب کھلے۔

(ہو ہی بے حس اور ڈھیٹ، چاہتے ہو نہ مسئلہ سنوں نہ ہی حل کرنا پڑے۔)

”یار! پر امس کر تو رہا ہوں۔“

(اب کیا کان پکڑو او کی تھانے دارنی۔)

”ہاں، بس خالی خولی پر امس۔“ وہ منمنائی۔

(تم اور تمہارے وعدے، میری عمر کے دس سال کھا گئے تمہارے یہ کھوکھلے، جھوٹے وعدے۔)

”چلو اب ایک پیاری سی اسمائل دے دو تاکہ میں سکون سے سو سکوں۔“

(پورے دن کے کوٹے میں گنتی کی دو چار مسکراہٹیں ہی ہوتی ہیں تمہارے پاس۔۔۔ اگر آج کے کوٹے میں سے کوئی باقی بچی ہے تو دے مارو۔)

”دل تو کر رہا ہے تم سے خوب لڑوں مگر ایک تو تم نال زیادہ دیر خفا بھی نہیں رہنے دیتے۔“

(ایسی مسکینی شکل پہ طاری کر لیتے ہو، خواہ مخواہ ہی ترس آجائے۔)

”یہ ہوئی نابات، اسی مسکراہٹ پہ تو ہم فدا ہیں جانو! یہی تمہاری مونالیزا اسمائل۔“

(چلو کم از کم یہاں تو جھوٹ نہیں بولنا پڑا۔ واقعی اس پھیکے سے چہرے پر مونالیزا کی طرح مسکراتی ہو۔)

دل پہ جبر کرتے ہوئے جیسے کوئی گن پوائنٹ پہ مسکرانے پر مجبور کر رہا ہو۔)

”پتا ہے میں کیا کہہ رہی تھی؟۔“

ماحول سازگار ہوتے ہی وہ تکیہ گود میں رکھ کے بیٹھ گئی۔ اور رامش کا دل بیٹھ گیا۔

(سوئی ابھی تک وہیں انگی ہے۔ جب تک بھڑاس نہ نکل جائے نہ اس کو سونا ہے نہ مجھے سونے دینا ہے۔ جہاں اتنے سال گزر گئے دل مارتے ہوئے یہ ایک رات اور سہی۔)

”بچوں کی ضد ہے کہ اس بار گرمیوں کی چھٹیاں ہمیشہ کی طرح وہ گھر پہ نہیں گزاریں گے، ہفتہ دس دن کہیں نہ کہیں رہ کر آئیں گے اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس بار میں بھی ان کی خواہش کو نظر انداز نہیں کر سکی۔ وہ کوئی ناجائز فرمائش تو نہیں کر رہے، نہ ہی زمانے سے انوکھی ضد ہے۔ ساری دنیا چھٹیوں میں کہیں نہ کہیں جاتی ہے۔“

”ساری دنیا کے رشتے دار ہمارے رشتے داروں کی طرح تندوروں میں نہیں رہتے۔ تمہارے میکے والے ملتان میں رہتے ہیں اور میرے میکے۔ میرا مطلب ہے میرے دونوں بھائی۔۔۔“

”تو کیا ضروری ہے چھٹیاں کسی نہ کسی کے سر پہ سوار ہو کر گزارنی جائیں۔ اور لوگوں کی طرح ہم مری سوات یا ایبٹ آباد کیوں نہیں جاسکتے؟“

”یہ بات تم اچھی طرح جانتی ہو اور اگر نہیں جانتیں تو پھر ہماری دس سالہ رفاقت پہ افسوس ہی کیا جاسکتا ہے۔“ وہ گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بہت سنجیدہ لگ رہا تھا۔

”جانتی ہوں، اس لیے اس دس سالہ رفاقت میں

ہوں آؤٹنگ کے لیے نکلا پلا کے لاتا ہوں وہ کیا ہے؟“

”ہاں آؤٹنگ ہے تمہاری اس موٹر بائیکل پہ ہم چاروں کالڈ کے جانا واقعی بہت بڑی عیاشی میں شمار ہوتا ہے۔ سردی ہے تو ٹھہرتے جاؤ، گرمی ہے تو ایک دوسرے سے چپک کے سینے بہاتے جاؤ۔ اور کھلانے پلانے کی خوب کھی، کسی کو دس روپے کے چپس، کسی کو پندرہ روپے والا برگر اور کسی کو پانچ روپے والی آئس کریم تمہا دیتے ہو اور مجھے تو ہمیشہ کولڈ ڈرنک پہ ٹرخایا ہے۔“

(اونہ! دس روپے کی بوتل، جس میں سے آدھی تم خود ڈکا جاتے ہو، بچوں کی نظریں الگ لگی ہوتی ہیں۔ اس قدر شرم آتی ہے سڑک پہ جب ایک بوتل پانچ ہاتھوں سے گزر کے خالی ہوتی ہے۔)

”چلو ٹھیک ہے اب تمہاری کمیٹی نکلی ہے، بھئی پیسے والی خاتون ہو، مجھ غریب پہ جتنی مرضی باتیں دھرو نہیں تو اتنا ہی انورڈ کر سکتا ہوں۔ ایسا کرو اس اتوار کی رات تم ہم سب کو اچھا سا ڈنر کراؤ، بچوں کو پلے لینڈ بھی لے چلیں گے۔“

”مجھے کیا ضرورت ہے ان بے کار کے چونچلوں میں رقم ضائع کروں۔“

”واہ اپنی باری آئی تو بے کار کے چونچلے۔“

(اب کیسے جان نکل رہی ہے چار روپے خرچ کرتے ہوئے، مجھے تو منہ پھاڑ کے ہر ایک کے سامنے کنجوس کہہ دیتی ہو۔)

”میں یہ پیسے بچوں پہ ہی خرچ کروں گی مگر اس طرح نہیں۔ پورے بارہ ہزار ہیں چاہوں تو اپنے لیے سونے کی کوئی چیز بھی بنا سکتی ہوں مگر میں نے سوچ لیا ہے یہ پیسے اگر استعمال ہونگے تو صرف ہماری فیملی ٹرپ پر پہلے تو اپنے دولان کے اور ایک چکن کا سوٹ بناؤں گی، ایک آپ کی جینز اور دوئی شرٹس بہت ہوں گی۔ بچوں کا ایک ایک اچھا سوٹ بھی بہت ہوگا۔ پچھلے مہینے آپ کے دوست کے بچے کی برتھ ڈے پارٹی پہ بھی ایک ایک مہنگا والا ریڈی میڈ سوٹ لیا تھا۔ ان سب پہ

میں نے کبھی ایسی فرمائش کی بھی نہیں۔“
(لیکن وہ مرد ہی کیا جو عورت کا احسان مان لے۔ ساری عمر کا ایثار منٹ میں فراموش کر دیتا ہے۔ جیسے اس وقت تم میری پوری بات سنے بغیر ان گزرے دس سالوں پہ افسس کر رہے ہو۔)

”میری کمیٹی نکلی ہے۔“

اس انگلشاف پہ رامش ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ ساری نیند بھک سے اڑ گئی۔ سستی ہوا ہو گئی۔ اور غنودگی میں ڈوبا، ہنرت نئے اخراجات گنوانے لگا۔

(اس مہینے کا بل اس کے سر ڈالوں؟ نہیں نہیں، اگلے سیشن کی تینوں بچوں کی فیسیں بھرنے کا کہوں گا۔ کچھ گرو سری تو وہ خود ہی خرید لے گی، اتنی انسانیت تو ہے۔ آخر میرے پیسوں سے ہی کٹوتی کر کر کے کمیٹی ڈالی ہے اتنا حق تو بنتا ہے میرا۔)

”گھر کے خرچے تو نکلتے ہی رہتے ہیں، دس بھرو تو پندرہ سر اٹھائے پھر موجود ہوتے ہیں۔ ان سے نمٹتے نمٹتے تو دس سال گزر گئے، باقی بھی گزر جائیں گے۔ کیوں نہ اس بار ہم ان سے ذرا سی نظریں چرا کے اپنے بچوں کی بھی مان لیں۔ انیس چند دن کی خوشیاں دے دیں۔“

(دل اپنا چل رہا ہوگا، نام بچوں کا لے لیا۔)

”اخراجات اور تفریحات میں بہت فرق ہوتا ہے۔ تفریح کے نام پہ ہم انہیں کیا دے رہے ہیں۔ شام کو روز ایک گھنٹہ اور ویک اینڈ پہ تین گھنٹے ٹی وی دیکھنے کی اجازت۔“

”اور وہ جو تم ہر دوسرے تیسرے دن تینوں کا ٹولہ لے کر نکلی ہوتی ہو کہ احمر کی سائیکلنگ ہو جائے گی، میری واک اور نمرا، رمن پارک میں سلائیڈ لے لیں گی۔ وہ کیا ہے؟“

(اور اس شام مجھے چائے تک خود بنا پڑتی ہے۔)
”سڑک کے اس جانب بنے کمیٹی کے چند گزر کے پارک میں بچوں کا آدھا گھنٹہ سائیکل چلا لینا اور سلائیڈ لے لینا تمہیں تفریح لگتا ہے؟“

”اور وہ جو اتوار کی شام میں تم سب کو باہر لے کر نکلتا

زیادہ سے زیادہ تین ہزار لگ جائے گا۔“

”باقی کے نو ہزار اگر تمہارے خیال میں کافی ہوں گے تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ یہاں سے مری تک جانے کے کرائے میں ہی ڈیڑھ دو ہزار لگ جائیں گے اور واپسی کے لیے بھی اتنا ہی چاہیے ہو گا۔ وہاں دو دن رہنے کے لیے بھی کم از کم آٹھ دس ہزار چاہئیں کچھ پتا ہے اس سیزن میں ہوٹلوں میں کرائے آسمان سے کیا کیا باتیں کر رہے ہوتے ہیں اور تم پروگرام بنا رہی ہو پورے ایک ہفتے کا۔“

”ہوٹلوں میں کون رہے گا۔ میں اتنی احمق نہیں جتنا تم نے مجھے سمجھ رکھا ہے۔ میری وہ دوست یاد ہے۔ وہ کھاریاں والی۔ جس سے تم مجھے شادی کے بعد صرف ایک ہی بار ملوانے لے کے گئے تھے اور وہ بھی ماتھے پہ سو سوبل ڈال کے۔“

(بے چاری صورت شکل کی ذرا گزارے لائق ہی تھی اور پھر اندھا کا نا پردہ بھی کرتی تھی یعنی مکمل تو نہیں مگر سوائے سلام آداب کے غیر مردوں سے کم ہی کلام کرتی تھی پھر تمہیں کیوں اچھا لگتا اس کے ہاں جانا۔ ہاں ہوتی اگر کوئی چھمک چھلو، چھیل چھیلی، مردوں کے ہاتھوں پہ ہاتھ مار کے تھقے لگانے والی، تب تم جی جان سے حاضری لگوانے جاتے۔)

”ہاں اور جو تمہارے صرف ایک بار جانے کے باوجود خود سال میں تین چکر لگاتی تھی۔ دوسرے شہر کی رعایت لیتے ہوئے کبھی ایک رات تو کبھی دو تین راتوں تک قیام ہوتا تھا۔ وہی مفت خوری؟“

”ہاں وہی۔۔۔ جو میری محبت میں بھاگ بھاگ کے آتی تھی اور آپ کی ناگواری بھانپ کے خود ہی پیچھے ہٹ گئی۔ اب پچھلے چار پانچ سال سے ہمارا صرف فون پہ رابطہ ہے۔ وہی مفت خوری اب مری شفٹ ہو گئی ہے۔ اور اسی مفت خوری نے مجھے دعوت دی ہے کہ میں اپنی فیملی سمیت اس کے گھر میں ایک ہفتہ گزارنے آؤں۔“ مہمان نے چبا چبا کر کہا۔

قدرے مفت تفریح نے رامش کو بھی کچھ سوچنے پہ مجبور کر دیا۔

”یہ کسی حد تک گوارا ہے۔ مگر میرے خیال میں تم نے یہ کپڑوں کی شاپنگ وغیرہ کا خرچہ اضافی شامل کیا ہے۔ اگر ہم پہلے سے موجود کپڑے پہن کے چلے جائیں تو مری والے ہمیں واپس تو نہیں بھیج دیں گے۔ اس کے بدلے اگر تم مجھے زیادہ نہیں صرف چار ہزار روپے ادھار دے دیتیں۔۔۔“

اتنا کہہ کر اس نے مہمان کے تاثرات جانچنا چاہے جواب بھی حیرت انگیز طور پہ پر سکون تھے، اس سے اس کا حوصلہ بڑھا اور باقی کا فقرہ اس نے پر اعتماد لہجے میں مکمل کیا۔

”تو میں جلدی ہی تمہارا قرض چکا دوں گا۔ ستمبر میں ایک بڑی ڈیل فائنل ہونے والی ہے۔ ہو سکتا ہے پہلے ہی ہو جائے۔“ وہ چھوٹے پیمانے پہ پراپرٹی ڈیلنگ کا بزنس کرتا تھا۔

(مجبوری نہ ہوتی تو کبھی یہ رقم ادھار لے کر تمہیں چوکننا نہ کرتا، اب تمہارے ہزار سوالوں کا جواب کون دے لیکن ستمبر تک کا تو کیا اگلے مہینے تک کا انتظار بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے ٹھیک دس دن بعد ہر حال میں یہ رقم چاہیے تھی، لگتا ہے اللہ نے تمہارے وسیلے ہی میرا کام بنا دیا۔)

”چلو ٹھیک ہے۔“ مہمان نے بغیر کسی سوال کے ہامی بھری یہ ایک اور حیرت بھر واقعہ تھا۔

”مگر یاد رہے، ادھار ادھار ہوتا ہے۔ میری رقم ہضم کرنے کی کوشش مت کرنا۔“

(جیسا کہ اوروں کے ساتھ کرتے رہتے ہو۔)

”ہاں ہاں کیوں نہیں سویٹ ہارٹ!“ اتنا کہہ کر اس نے وال کلاک پہ ایک اور نظر ڈالی۔ پونے دو بج رہے تھے۔ اس نے تکیہ درست کر کے لیٹنے میں دیر نہ لگائی۔

البتہ مہمان ٹیبل لیمپ آف کرتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔

(اچھا ہوا میں نے بارہ ہزار بتایا، اصل رقم یعنی پندرہ ہزار کے بارے میں نہیں بتایا ورنہ تم چار کے بجائے چھ ہزار ادھار مانگتے اور مجھے دس دن بعد کسی اور کام نہ

دیکھنا پڑتا۔ یہ تین ہزار میں نے اسی دن کے لیے تو الگ رکھے ہوئے ہیں۔)

27 جون

”ایک گڈ نیوز ہے۔“

ناشتے کی ٹیبل پہ میہا نے با آواز بلند اعلان کیا۔ جس پہ اخبار پڑھتا رامش بری طرح ہڑبڑا کر رہ گیا۔ آنکھوں میں بے یقینی بھر کے اس نے میہا کو دیکھا۔

”کیا واقعی؟ ایک اور گڈ نیوز؟“

میہا جھینپ کر رہ گئی۔

”میں رات والی پلاننگ بچوں کو بتانا چاہ رہی تھی تم بھی نا۔!“ اس نے سر جھٹکا اور دوبارہ بچوں کی جانب متوجہ ہوئی جو اپنا ذکر سن کر اب دلچسپی لینے پہ مجبور ہو گئے تھے۔ ساڑھے آٹھ سالہ نمرہ اور چھ سالہ احمد۔ جبکہ سب سے چھوٹی ساڑھے تین سال کی رمنہ بدستور اپنے جیم بریڈ میں لگن تھی۔

”میں نے اور تمہارے پیانے فیصلہ کیا ہے کہ اس بار ہم سب ایک ہفتے کے لیے مری جائیں گے۔“ اس اعلان نے ان کو ناشتہ و اشہ سب بھلا دیا۔ وہ مزید تفصیلات جاننے کے لیے بے چین نظر آنے لگے۔

”فی الحال آپ لوگوں کا سرکیمپ چل رہا ہے۔ دو ہفتے بعد مکمل طور پہ فری ہو جاؤ گے تو چلیں گے۔ پیانے بھی تب تک انتظامات کر لیں گے، ظاہر ہے انہیں بھی اتنے دن آفس بند رکھنا پڑے گا۔“

رامش اس نئی فکر میں مبتلا ہو گیا۔ پہلے ہی اس کا بزنس کوئی خاص اچھا نہ چل رہا تھا، بلکہ درمیانے درجے کے تمام کاروبار یونہی ٹھپ پڑے تھے۔ بس گزارا ہو جاتا تھا۔ ایسے میں پورے ایک ہفتے کے لیے اسے بند ہی کرنا پڑے تو ظاہر ہے کہ فرق تو پڑے گا۔ ابھی وہ ڈھنگ سے اس پریشانی کو پوری طرح خود پہ سوار بھی نہ کر پایا تھا کہ فون کی بیل نے اس کی توجہ بانٹ لی۔

”ہیلو!“ وہ چپکی۔

آج صبح ہی سے میہا کا موڈ خاصا خوشگوار تھا اور یہ

ایک خلاف معمول بات تھی کیونکہ صبح سویرے کام کا اتنا لوڈ ہوتا تھا کہ وہ خواہ مخواہ چڑچڑی سی ہو جاتی۔ آج موڈ کی یہ خوش گواریت رات کے پروگرام کی وجہ سے تھی۔ ورنہ فون اٹھاتے ہی وہ اتنی خوش مزاجی دکھانے کی عادی نہ تھی۔ پہلے یہ اطمینان کیا جاتا تھا کہ دوسری جانب ہے کون۔ پھر اس کی اوقات کے مطابق اخلاق بگھارا جاتا۔

”اسے۔۔۔ ناہید باجی۔!“

اس کی چچماہٹ ذرا دھیمی پڑی۔ اب وہ اپنی نند کو سلام کرتے ہوئے مدد طلب نگاہوں سے رامش کو بھی دیکھ رہی تھی۔ ناہید سے بات کرتے ہوئے اس کی ساری طراری ہوا ہو جاتی تھی۔ وہ قدرے محتاط رہا کرتی پھر بھی ناہید جیسی نکتہ چین نند کو اس کی کوئی نہ کوئی بات پکڑنے کا موقع مل جاتا۔ رامش اپنی بڑی بہن کی فطرت سے آگاہ تھا مگر عمر کے دس بارہ سال کے فرق کی وجہ سے لحاظ کرنے پہ مجبور تھا۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ ناگزیر حالات میں وہ کتنی بگھار میہا کو اداوی کمک ضرور پہنچا دیا کرتا لیکن آج اس نے بھی نظریں پھیر کے مکمل توجہ اخبار پر جماتے ہوئے گویا ہری جھنڈی دکھا دی۔

”ہاں جی گرمی تو یہاں بھی بہت ہے۔ نہیں باجی! لاہور میں زیادہ ہے۔ اس قدر کہ آپ تصور بھی نہیں کر سکتیں۔“ وہ شد و مد سے لاہور کو شعلوں میں گھرا ہوا ثابت کر رہی تھی۔

”روز در جنوں لوگ مر رہے ہیں، بیماریاں پھیل رہی ہیں، گھر سے باہر نکلنا محال ہے۔ اور گھر کون سا کم ہیں۔ دہک رہے ہوتے ہیں بھٹی کی طرح۔“

”نہیں اسی پورشن میں کچھ زیادہ ہی پیش ہے۔ آپ نے تو سردی میں وزٹ کیا تھا۔ وہ پچھلا گھر پھر کچھ اچھا تھا۔ پورشن بھی نیچے والا تھا۔ یہاں ہر طرف سے دھوپ پڑتی ہے۔“

”کہاں باجی! اے سی ہر وقت تو نہیں لگا رہ سکتا۔ اتنا بل کون دے۔ دوپہر کو ایک گھنٹہ لگا کر کمرے کو ذرا اس قابل کر لیتی ہوں کہ بچے سو جائیں۔ رات کو بھی تین

گھنٹے چلاتے ہیں اور سچی ہم تو اتنا ہی انورڈ نہیں کر سکتے مگر رامش کہتے ہیں بچے بیمار ہو جائیں تو۔ اس سے کہیں بہتر ہے کہ ہم کھیچ تان کے کسی طرح بجلی کا بل زیادہ دے دیں۔“

”نہیں۔ نہیں۔ باجی! میرا یہ مطلب آپ۔ آپ۔“ وہ ایک دم بری طرح بوکھلا گئی دوسری طرف ناہید شاید اس کی ایک بات سننے پر تیار نہ تیس اسی لیے وہ بار بار ”آپ۔ آپ۔“ کہتی منہ کھول کے رہ جاتی۔

”آپ۔ آپ میری بات تو۔۔۔“

آخر رامش اخبار رکھ کر اٹھا اور اس کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا۔ دوسری جانب ناہید زور و شور سے برس رہی تھی۔

”بی بی! شکر کیا کرو اللہ کا۔ تمہیں تو جب بھی سنا“ رونے رو تے ہی سنا۔ تم جیسی ناشکری عورتوں کی وجہ سے ہی مردوں کا رزق بندش کا شکار ہوتا ہے۔ میرا بھائی بے چارہ رزل کے رہ گیا ہے تمہارے لیے کما کما کے پھر بھی کبھی ایک کلمہ شکر کا تمہارے منہ سے ادا نہیں ہوا۔ ماشاء اللہ اچھا کھاتے ہو، اچھا پہنتے ہو، کس چیز کی کمی رکھی ہے میرے بھائی نے۔ یا پھر اصل بات کرو کہ یہ ”تھوڑا، تھوڑا“ کی گروان ہم بہنوں کو سنائی جاتی ہے۔ بس کون سا تم سے کچھ مانگے آتے ہیں۔“

”باجی! بس بھی کچھ خدا کے لیے۔ آپ کو پتا تو ہے کہ میہا کی باتوں کا کوئی مطلب ہی نہیں ہوتا۔“ (حالانکہ مجھ سے زیادہ کون جانتا ہے کہ اس کی ایک بات کے کتنے مطلب نکلتے ہیں۔ آپ نے جو مطلب نکالا ہے وہ تو کچھ بھی نہیں۔)

”رہنے دو رامش! شادی کے اگلے روز سے تم اس کے بچنے اور بھولہ پن کے راگ الاپ رہے ہو۔ دس سال ہو گئے ہیں اسے بیاہی عورت بنے۔ تین بچوں کی ماں ہے اتنی سستی منی نہیں رہی جتنا تم ثابت کرنے میں ہلکان ہوتے رہتے ہو۔ جیسے ہی میں فون کروں یہ چھوٹے ہی اپنے مسئلے مسائل بیان کرنا شروع کر دیتی

ہے، ہولا کے رکھ دیتی ہے تاکہ سہم کے ہم بہنیں تمہارے ہاں آنے کا خیال ہی ترک کر دیں۔ تم سے ملنے کو ترس کے رہ جائیں۔ اب ہی دیکھ لو، پہلے گرمی کے اور اب حالات کے ڈراوے دیے جا رہے ہیں۔“

”اوہو باجی۔! کون ہے جس کی زبان یہ آج کل گرمی کی شکایت نہیں۔ اگر اس نے کہہ دیا تو۔۔۔“

”بس کرو رامش۔! جو کسر رہی ہے اپنی بیوی کی جانب سے، وہ اب تم پوری نہ کرنے بیٹھ جانا۔ اس نے تو یہ ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کہ تمہارے گھر میں لاوا ایک رہا ہے اور ان دنوں یہاں آنا بلکہ لاہور شہر کا رخ کرنا بھی بے وقوفی ہے۔ ہے ناں؟“

”نہیں باجی! ایسی بات نہیں۔“ وہ کھسیا گیا۔ (اگر میہا نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا بھی ہے تو بے کار رہا۔ آپ کے تیور بتا رہے ہیں کہ آپ کسی کی زور آزمائی سے دبنے والی نہیں۔)

”آپ کا اپنا گھر ہے، جم جم آئیے۔“ طوعاً و کرہاً“ اسے کہنا پڑا حالانکہ بہن سے محبت ہونے کے باوجود وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھا کہ وہ کس قدر تکلیف دہ قسم کی مہمان ثابت ہوتی ہیں۔

”جیتے رہو، اسی طرح گلچے میں ٹھنڈ ڈالتے رہو۔ کیا کریں۔ بچوں کی چھٹیاں ہو میں تو تب سے رٹ پکڑی ہے کہ ماموں کے ہاں جانا ہے۔ میں نے بھی کہا۔ دیکھو۔ اس بار ذرا انتظار کرو۔ پتا تو چلے بھائی کو خود خیال آتا ہے یا نہیں۔ دو ہفتے تک انتظار کرنے کے بعد باپوس ہو کے میں نے خود فون کیا۔ غلطی تمہاری نہیں۔ دل میں تو تمہارے بہت جگہ ہے بس بیوی نے جان بوجھ کر بے پروا سا بنا دیا ہے۔ تم ایسی چھوٹی چھوٹی نزاکتوں کا خیال ہی نہیں کرتے کہ ان موقعوں پہ بہنوں کو خود دعوت دے کر بلا تے ہیں۔“

ایسی ہی کچھ اور چکنی چپڑی کر کے انہوں نے فون بند کر دیا۔ اب رامش کو ایک نیا مرحلہ درپیش تھا۔ ناہید نے زور زبردستی خود کو دعوت دلوادی تھی اب اس ناگہانی سے میہا کو بھی تو آگاہ کرنا تھا۔

”کیا کہہ رہی تھیں؟“ بظاہر برتن سنبھالنے میں

مصروف میہانے سرسری انداز میں پوچھا حالانکہ جتنی دیر وہ بات کرتا رہا اسے بے چینی لگی رہی تھی۔
(بلکہ یوں کہنا چاہیے کیا صورت پھونک رہی تھیں جو تم گم صم بے زبان بنے کھڑے تھے۔)

”آج پرانے بہت خستہ بنے ہیں۔“ اس نے لقمہ توڑا۔ (لاحول و لا۔۔۔ ایسے جیسے کھی میں ڈوبا گرم گرم رہا۔)

”فون پہ انہیں پراٹھوں کی جستگی بھی معلوم ہوگئی؟“

”نہیں وہ تو بس یونہی کہہ رہی تھیں کہ بچوں کی چھٹیاں ہوگئی ہیں۔“

”ہاں تو اس میں فون کر کے پورے پاکستان میں نشر کرنے والی کون سی بات ہے۔ ان کے بچے انوکھے ہیں کیا؟ جن کی چھٹیاں ہوئی ہیں۔ سارے پاکستان میں ہوئی ہیں۔“ وہ چڑ رہی تھی۔

”شاید کل یا پرسوں وہ آئیں۔“ پرانے کی پلیٹ سے سر اٹھائے بغیر اس نے کہا۔

”شاید کیوں؟ وہ ہمیشہ ٹکٹ خریدنے کے بعد صرف بتانے کے لیے فون کرتی ہیں۔ جب آپ کو ان کی آمد کے وقت تک کا پتا ہے تو یہ شاید کا دم چھٹا لگانے کی کیا ضرورت ہے؟“

”میرا دماغ مت خراب کرو۔“
”مجھے کیا ضرورت ہے بے کار کی محنت کی۔ میرے پاس کرنے کو اور بہت کچھ ہے۔“

(یہ فریضہ تمہاری ہمشیرہ صاحبہ آکر انجام دے لیں گی۔ انہیں دوسروں کے دماغ خراب کرنے کے سوا اور آتا بھی کیا ہے۔)



28 جون۔

رات کو کسی وقت بالآخر ڈرتے ڈرتے رامش نے اسے اصل بات بھی بتادی کہ ناہید باجی مع اپنے بچوں اور شوہر کے کل دوپہر کی ٹرین سے پہنچ رہی ہیں۔ اس کی اپنی شکل پہ اس وقت اپنی بے چارگی کئی کہ میہا

چاہنے کے باوجود اسے دو چار کراری باتیں نہ سنا سکی۔ یہ اور بات کہ اس خواہش کو اس نے حسرت میں بدلنے نہ دیا اور حسب عادت دل ہی دل میں غبار نکال لیا۔

”ویسے اس بار ان کا قیام زیادہ طویل نہیں ہوگا۔ بتا رہی تھیں صرف تین دن تک رکیں گی۔“

(یہ الگ بات کہ تمہارے لیے یہ تین دن بھی تین صدیوں کے برابر ہوں گے۔ میرے بہن بھائیوں میں سے کسی کو تین منٹ بھی جھیلنا تم سے برداشت نہیں ہوتا یہ تو پھر تین دن ہیں۔)

”ان کے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ اس سے پہلے کبھی ایسا ہوا ہے کہ جو انہوں نے ”کہا“ ہے وہی ”کیا“ بھی ہو۔“ وہ بڑبڑاتی رہی۔

”اوس۔۔۔ وہ۔۔۔ کچن وغیرہ کی کیا صورت حال ہے؟ کچھ خاص سودا تو نہیں منگوانا۔ ابھی پچھلے ہفتے تم نے کچھ اضافی۔۔۔“

وہ کان کھجاتے ہوئے بہت ہمت کر کے ابھی اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ میہا پلیٹ کر کاٹ کھانے کو دوڑی۔

”کون سا اضافی سامان؟ گرمیاں ہیں کچھ شربت، اسکو اٹش وغیرہ لیے تھے۔ چھٹیوں کی وجہ سے بچے سارا دن گھر پہ ہوتے ہیں اور گھڑی گھڑی کچھ کھانے کو مانگتے ہیں اس وجہ سے کسٹرو، جیلی وغیرہ کے کچھ فلیورز لیے تھے اور نوڈلز کے ڈھیر سارے پیسٹس، مختلف طرح کے بسکٹس کے ہاف رولز۔ کیا ان سب سے تین دن تک میں تمہاری بہن کے کنبے کی تواضع کروں؟“

(جو کہ سارے کے سارے کھانے کے معاملے میں اس قدر ”پیٹو“ ہیں کہ بس تو بس۔ ناہید باجی ہیں جو ہانڈی بھونتے بھونتے ہی بیچ میں سے آڑھ درجن بوٹیاں اچک لیتی ہیں اور میاں ان کے ایسے ندیدے، فرمائش کرتے کرتے ہلکان بھی نہیں ہوتے، حلیم، نہاری، بریانی، پسندے، چن چن کے مشکل ترین اور مہنگی ترین ڈشیز کی فرمائشیں نشر ہوتی ہیں۔ بچے ہیں تو وہ دو دو بار ناشتا کھونے کے عادی۔ اچھا ہے تمہارا توجاؤ پورا ہو بہن کو بلانے کا۔)

”لیکن یار! میرے پاس تو آج کل۔۔۔“ اس نے

شکل پر اچھی خاصی بے چارگی طاری کر لی مگر وہ بے اعتنائی سے بالوں میں برش کرتی رہی۔
 ”اس بار آفس کا کرایہ بھی بہت لیٹ دیا ہے اور پرسوں جو چیک ملا تھا وہ مختار کا قرضہ چکانے میں دے دیا۔ چھ ماہ ہو رہے تھے وہ تقاضا کر کے جان کھا رہا تھا۔“

اب وہ بال بینڈ میں جکڑ کے حسب معمول ہاتھوں پہ لوشن ملنے لگی۔

”کل پھر کسی کے آگے ہاتھ پھیلا نا پڑے گا۔ ذلیل ہونا پڑے گا۔ تمہارا کیا ہے تم تو یہی کہو گی تمہاری بہن ہے اسے آنے کی دعوت بھی تم نے دی ہے تم ہی بھگتو مگر تاؤ پھر میں کیا کرنا۔ بڑی بہن ہے مان سے بات کر رہی تھی۔ کیا میں اس کا مان توڑ دیتا۔“ وہ بد ستور ہاتھوں کا مساج کرتی رہی۔

(پتا نہیں ان ہاتھوں کے چاؤ چونچلے کر کے اسے کیا ملتا ہے کوئی ہے جو اسے بتائے کہ چہرے اور ہاتھوں کی کلیننگ سے فرصت ملے تو کبھی دل کا میل بھی صاف کر لے۔)

وہ جلتا بھٹتا سونے کی کوشش کرنے لگا۔ صبح ناشتے کی ٹیبل پر بھی چہرہ اتر اہوا تھا جب میہا نے اس سے کہا۔

”سنو رامش! اب مزید کسی سے قرضہ لینے کی ضرورت نہیں۔ بہت مشکل سے میں نے ان دس سالوں میں تمہاری یہ عادت چھڑوائی ہے۔ یاد ہے شادی کے موقع یہ تم نے کتنا قرضہ بڑے چڑھار کھا تھا اور تب تمہارا بزنس بھی نیا نیا تھا۔ اگر قرضہ اتارنے کی پخ ساتھ نہ ہوتی تو تم اپنا بزنس جما سکتے تھے اور آج کہیں کے کہیں پہنچے ہوتے۔ مگر ان دنوں تم جو کماتے تھے اس کا ایک بڑا حصہ قرض کی ادائیگی میں چلا جاتا تھا۔ اللہ اللہ کر کے تمہیں اس بری لت سے نکالا ہے دیکھ رہی ہوں آہستہ آہستہ پھر یہ چسکا پڑتا جا رہا ہے۔ پہلے مختار کا قرضہ چھ مہینے تک سر پہ تلوار کی طرح لٹکتا رہا اب پتہ نہیں کس کو پیچھے لگواؤ گے۔ صبح صبح کال بیل بج رہی ہو گی اور شام سے رات تک فون کی بیل۔“

”اب تم میری کوتاہیاں اور اپنے کارنامے گنونا بند کرو۔ میں سخت پریشان ہوں کوئی مشورہ نہیں دے سکتی۔ تو کم از کم طعنوں کی ترسیل ہی بند کرو۔ دو تین ہزار قرضہ لے لینے سے کوئی آسمان نہیں گر پڑے گا سر پر۔ یہ نہ کروں تو اور کیا کروں؟ ڈاکا ڈالوں؟“

”جہاں چار ہزار ادھار دے سکتی ہوں وہاں تین ہزار اور دیتے ہوئے میرا کیا جاتا ہے۔“ اس نے برتن سمیٹتے ہوئے بے تاثر سے لہجے میں کہا۔

(آخر تم بغیر کچھ کہے مجھ سے نکلوانے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ کیا کروں کوشش کے باوجود تمہارے جیسی بے حس اور لا تعلق نہیں بن سکتی۔)

”اوہ تھینکس میہا۔! ایسا کرو تم ضرورت کی سب چیزیں لے آنا، بلز مجھے دے دینا میں دو تین ہفتوں میں سارے پیسے چکا دوں گا۔“

(اور ان دو تین ہفتوں تک تم جس طرح میرے سر پہ سوار ہو گی اس کا ازیت ناک تجربہ مجھے ہے۔ مگر فی الوقت اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہیں۔)

”دو تین ہفتے؟ مجھے دس دن کے اندر اندر ایک ایک پائی چاہیے۔ ٹھیک پندرہ دن بعد ہمیں مری کے لیے بھی نکلنا ہے۔“

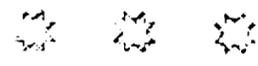
(اچھی ہے بے چاری۔ زبان کتنی ہی کڑوی کیوں نہ ہو وقت پر کام آہی جاتی ہے۔)

کافی عرصے بعد اس کے دل نے کوئی مثبت سرگوشی کی اس کے بارے میں۔

ناہید باجی کی فیملی کو شام پانچ بجے والی ٹرین سے لاہور پہنچنا تھا اور رامش کو گھر سے نکلتے نکلتے دس بج گئے تھے اس کے جانے کے بعد میہا نے صفائی والی ماسی سے پہلے کمرے صاف کروائے اور پھر سب لاک کرنے کے بعد نمروہ اور احمر کو لاؤنج میں بٹھایا۔ ماسی کی نگرانی میں دے کر خود رونا کو ٹرائر میں بٹھا کر گھر کے نزدیک واقع مارکیٹ کی جانب نکل گئی۔ باہر خاصی گرمی تھی دل تو نہ چاہ رہا تھا رونا کو ساتھ لے جانے کو مگر نمروہ اور احمر کارٹون دیکھنے کے دوران کسی قسم کی ذمہ داری لینے کو تیار نہ ہوتے تھے اور ماسی کے ذمے بھی ابھی

خاصا کام باقی تھا۔ جبکہ معمول کی صفائی میہا خود ہی روز کے روز کر لیا کرتی تھی۔

گوشت، مرغی، قیمہ، اضانی سبزی، چاول، چینی اور کولڈ ڈرنک کی لیٹروالی بوتلیں لینے میں ہی اس کے دو ہزار تک لگ گئے۔ وہ لوگ ہفتہ بھر رہنے آئیں تب بھی دن میں کم از کم ایک بار کھانا پر تکلف طریقے سے کھانے کی توقع کرتے تھے اور اس بار تو قیام صرف تین دن کے لیے تھا۔ ناہید باجی تو چاہیں گی، یروٹو کو ل پہلے سے بڑھ کر شاہانہ ہو۔ ایک ہفتے کی کسرتیں دن میں نکلے۔ ان کی بہت سی عادات کو دل سے ناپسند کرنے کے باوجود وہ چاہتے ہوئے ان سے بلکہ کسی سے بھی رکھائی سے پیش نہیں آسکتی تھی، نہ ہی بے مروتی پر ت سکتی تھی۔ کیونکہ نہ اسے اس چیز کی تربیت ملی تھی نہ ہی ایسی فطرت۔



30 جون

”آج زرا جلدی گھر آجانا۔“ میہا نے صبح صبح تاکید کی۔

”کیوں آج کوئی معرکہ ہوتا ہے؟“

وہ پچھلے دو دن سے اپنی بہن کی نکتہ چینی بھی سن رہا تھا اور نازک مزاجیاں بھی دیکھ رہا تھا۔ اس سب کے جواب میں گرچہ میہا کی پر تحمل خاموشی قابل داد و تحسین تھی مگر ایسا بھی نہ تھا کہ اس کے ماتھے کے بل اس سے پوشیدہ رہ پائے ہوں۔ وہ تو منتظر تھا کہ کب اس کی زوجہ محترمہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا ہے۔

”میرا دماغ اتنا خراب نہیں جو اپنے سارے کیے کرائے پہ پانی پھیر دوں غرضوں کے معرکوں میں۔۔۔ جہاں اتنا برداشت کیا وہاں ایک دن اور سہی کل ناہید باجی کو واپس جانا ہے کہہ رہی تھیں کہ آج انار کھلی کا ایک چکر لگائیں گی۔ مجھے ساتھ جانا ہو گا۔ بچوں کی وجہ سے تمہیں جلدی گھر آنے کا کہہ رہی تھی۔ ویسے تو بھائی جان بھی گھر پہ ہی ہوں گے مگر بیوی آن ہو تو ان کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا معرکہ

دیکھنے کا شوق ہمارے اور ان کے بچے مل کے پورا کر دیں۔“

(کاش ایسا ہو جائے تو کتنا اچھا ہو۔ وہ ”چھتے“ بالوں والا بنو، کاش رمناکا مٹھی میں ایک بار اس کے بال آجائیں یا پھر احمر ہی ہمت کر کے اس موئے مانی کے پیٹ میں لات دے مارے۔ اور نمروہ۔ کتنے تیز آری نمادانت ہیں اس کے، مگر اپنے بہن بھائیوں پہ آزمانے کے لیے ہی رکھ چھوڑے ہیں، ایک بار ذرا نمی یا ڈولی کو کاٹ کے دکھائے، بلبلائی ہوئی ماں کے پاس جائیں گی۔)

شام کو رامش واقعی جلدی گھر آ گیا اور اس نے دونوں خواتین کی ہمت کی داد غائبانہ طور پر دی جو اس تباہ کن گرمی میں بھی انار کھلی جیسے پر ہجوم بازار میں شاپنگ کا شوق پورا کر رہی تھیں۔

رامش کے آنے کے تقریباً ڈیڑھ پونے دو گھنٹے بعد ان دونوں کی واپسی ہوئی۔ رامش نے بغور دونوں کے تاثرات جانچے۔ ناہید باجی خلاف معمول چمک رہی تھیں جبکہ میہا کا چہرہ اترا اترا سا تھا۔ کھانا جو وہ جانے سے پہلے تیار کر گئی تھی وہ بھی اس نے بہت بے دلی سے لگایا اس کی پڑمردگی کی وجہ رامش کو تب معلوم ہوئی جب کھانے کے بعد ناہید باجی نے لہک لہک کے اپنی شاپنگ سب کو دکھائی۔

”یہ چکن کا سوٹ دیکھیں، اور یہ میچنگ سینڈل۔ چاروں بچوں کے یہ ریڈی میڈ سوٹ تو دیکھیں کتنے خوبصورت ہیں۔“

”اتنی فضول خرچی کی کیا ضرورت تھی۔ ابھی ہم نے تمہارے بڑے بھائی کے پاں بھی جانا ہے اور پھر واپس گھر بھی۔ کرائے کی رقم کے لیے تو کچھ بچا رکھتیں۔“

ان کے میاں ہڑبڑا کر کہہ رہے تھے۔
”یہ تو مجھے میکے سے ملے ہیں۔ میرے بھائی کے گھر سے۔“ انہوں نے بڑے مان سے گردن اکڑا کر کہا اور رامش نے چونک کے میہا کو دیکھا جو نا محسوس طریقے سے سب کے درمیان سے اٹھ کے اپنے

کمرے میں جا رہی تھی۔

”کچھ نہیں لے کے دیا میں نے۔“ اس کے پوچھنے پر وہ پھٹ پڑی۔

”تم سب کو دو سروں سے زبردستی نکلوانے کا فن خوب آتا ہے۔ مجھ سے صرف اتنی غلطی ہوئی کہ اپنے لیے چکن کا سوٹ لیتے ہوئے یونسی رواروی میں ان سے پوچھ بیٹھی کہ ”با جی! کیسا سوٹ ہے؟“ انہیں نجانے کیا سمجھ میں آیا فوراً ”کھل گئیں اور لگیں سوٹ کی تعریفیں کرنے۔ اسے خریدنے کے بعد میں نے کہا، اس کے ساتھ میچنگ کی سینڈل ضرور ہونی چاہیے۔ تب بھی بڑا شرما کے کہا۔ ”ارے نہیں، اس کی کیا ضرورت ہے۔“ اور میں ایسی بے وقوف تب بھی نہ سمجھی فوراً ”سچی میں آ کے کہہ دیا کہ مجھے ہمیشہ سے یہ شوق رہا ہے مگر حالات نے اجازت نہ دی اب کمیٹی نکلی ہے تو کیوں نہ اپنے ارمان نکالوں۔ اور تم تو جانتے ہو رامش! مجھے واقعی سوٹ کے ساتھ میچنگ سینڈل خریدنے کا کس قدر کریر رہا ہے۔ بچوں کی بڑھتی ہوئی ضروریات نے دانستہ طور پر اپنی خواہشات سے غافل کر دیا تھا لیکن انہوں نے از خود اس کا مطلب یہ اخذ کر لیا کہ میں پتا نہیں کب سے انہیں تحفے تحائف دینے کو مجھل رہی تھی اور اب کمیٹی نکلنے کی خوشی میں۔۔۔“

شکر ہے خدا کا میں نے ایک موقع پر تو عقل سے کام لیا کہ کمیٹی کا رازا نکلنے کے بعد سنبھل گئی اور ان کے اگلے تفتیشی سوال کے جواب میں رقم صرف پانچ ہزار بتائی، لیکن پھر بھی انہیں شرم نہ آئی۔ میں تو تب ہٹکلی جب سیلز میں نے سینڈل میرے آگے رکھی اور انہوں نے اپنا پیر اس میں پھنسا کے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے ایک نمبر بدلانے کا کہا۔ میں تو منہ دیکھتی رہ گئی اب کہتی تو کیا کہتی۔۔۔ بھرے بازار میں تماشا بننے والی بات تھی۔ اس کے بعد اپنی جانب سے میں نے بڑی عقل مندی کا ثبوت دیا کہ مردانہ کپڑے کی دکان میں گھتے ہوئے صاف جتا دیا کہ میں رامش کے لیے سوٹ خریدنا چاہ رہی ہوں مگر انہوں نے مجھ سے ایک

قدم بڑھ کے اپنی ڈھٹائی کا ثبوت دیا اور فوراً ”کہہ دیا۔ اپنے بھائی جان کے لیے بالکل ویسا ہی سوٹ خریدنا جیسا رامش کے لیے لوگی، دونوں سالہ بہنوئی ایک سے سوٹوں میں کتنے کیوٹ لگیں گے۔“

ہونہ۔ کیوٹ۔۔۔ بڑھے۔ کیوٹ۔۔۔“

”اپنا غصہ مجھ سے کیوں نکال رہی ہو۔“ سارا بیان خاموشی سے سنتا رامش اس خطاب پر جھلا اٹھا۔

”تو اور کس پر نکالوں؟ میری ہر عقل مندانہ چال کا جواب انہوں نے اس ماہرانہ عیاری سے دیا ہے کہ جواب نہیں۔ اپنی طرز کا ایک ہی پس ہیں تمہاری ہمشیرہ۔ میرے جیسی بھلا کہاں ان کے ساتھ پوری آسکتی ہے۔ ان کی حرکتوں سے ڈری میں بچوں کے لیے کچھ لینے کا خیال ترک کر کے واپس جانے والی تھی۔ پوچھنے لگیں، بچوں کے لیے کچھ نہیں لوگی؟ میں کوئی کرار سا جواب دیتی کہ خود ہی میرا بازو گھسیٹ کے چلڈرن گارمنٹس کی شاپ کی طرف مڑ گئیں یہ کہتے ہوئے کہ میرے بچے بہت حساس ہیں، بہت محسوس کریں گے اس بات کو کہ ماموں ممانی نے ماما پاپا کو تو گفٹس دیے لیکن انہیں نہیں دیے۔ میں کیا بتاؤں رامش کس کس طرح تمہاری بہن نے مجھے زچ کیا۔“

آخر میں وہ رو ہی تو پڑی۔ رامش بھی ناہید کی حرکت پر شرمسار سا سر جھکائے بیٹھا تھا۔

”صرف دو ڈھائی ہزار روپے ہی الگ رکھے تھے میں نے شاپنگ کے لیے اور وہ بھی صرف مری جانے کے شوق میں ورنہ تمہیں تو پتا ہے کہ میں گرمیوں میں ڈھائی تین سو سے زیادہ کالاں کا سوٹ نہیں لیتی۔ اس بار اتنے چاؤ سے گیارہ سو کا چکن کا سوٹ خریدا، ساڑھے چار سو کی سینڈل اور وہ تمہاری با جی اچک کر لے گئیں۔ اب اور پیسے بھی فالتو نہیں کہ ڈھنگ کے کپڑے ہی بنالوں۔ میرے بچوں کے حصے کا بھی لے گئیں۔“

”مچلو، اب جانے دو۔ جو دے دیا سو دے دیا۔ بھلے دینے کی نیت ہی نہ ہو مگر اب اللہ کی طرف سے چلا گیا تو

اس یہ ملول ہونے کی بجائے دل بڑا کر لو۔ اللہ کوئی نہ کوئی تمہیں بنا ہی دے گا۔ ابھی دس دن باقی ہیں مری جانے میں شاید کوئی نہ کوئی بندوبست ہو ہی جائے۔“



کیم جولائی

کیا سہانی صبح تھی۔ بالآخر ناہید باجی نے اس بار اپنے کئے الفاظ کی لاج رکھی اور اسی تاریخ کو واپس لوٹیں جس تاریخ کا انہوں نے کہا تھا۔ ساری رات خوف کے مارے میہما کو تو نیند ہی نہ آئی کہ صبح اٹھنے پہ ان کا پروگرام بدلنے کی منحوس خبر نہ سننے کو ملے۔ صبح سات بجے کی ٹرین تھی۔ چھ بجے اٹھ کے اس نے بڑے ذوق و شوق سے ان کے سفر میں کھانے کے لیے قیمے والے راتھے بھی بنائے، روح افزا کا تھرماس بھر کے دیا اور ان کے نکلنے پر شکرانے کے نفل بھی ادا کیے ورنہ تین دنوں میں وہ جتنا خرچہ کراچکی تھیں اگر تین دن بھی اور رہتیں تو شاید وہ خود رامش کو کہیں سے قرضہ لانے پہ مجبور کرتی۔ وہ خود جو اس چیز کی سب سے بڑی مخالف تھی۔ اور تو اور تین دن اور تین راتوں تک مسلسل آن رہنے والا اے سی بھی ہلکان ہو گیا تھا۔

میہما بل کے ڈر سے اے سی دیکھ بھال کے لگاتی تھی مگر ناہید باجی نے ”گرمی گرمی“ کا شور مچا کر دن رات اسے لگائے رکھا، ابھی اگلے مہینے کے بل میں اس کا نتیجہ بھی بھگتنا پڑے گا۔ مگر آنے والے کل کے ہولناک نتائج کوئی الحال بھلائے وہ اس وقت ہلکی پھلکی ہو کے بیڈ پہ لیٹی تھی۔ رامش اسٹیشن تک ساتھ گیا تھا، بچے چھٹیوں کی وجہ سے دیر تک سوئے رہتے۔ وہ کافی عرصے بعد فراغت کے یہ لمحے انجوائے کر رہی تھی۔ اچانک فون بیل نے اسے کچھ بد مزہ تو کیا مگر سی ایل آئی اسکرین پہ امی کا نمبر جگمگا تا دیکھ کے بڑے چاؤ سے ریسیور اٹھایا۔ یہ وہی تھیں جو سو پرے سو پرے فون کیا کرتی تھیں، مگر انہوں نے آج جو خبر سنائی وہ۔

پندرہ منٹ بعد رامش آیا تو وہ بیڈ پہ ٹانگیں لٹکائے متفکر بیٹھی تھی۔ گود میں سیلی فون سیٹ تھا۔

”کس کا فون تھا؟“

”امی کا ملتان سے۔۔۔۔۔“ وہ مرے مرے انداز میں بولی۔

”اب وہاں سے کون کون آرہا ہے؟“ اس نے خود کو صوفے پہ گراتے ہوئے اکتائے ہوئے انداز میں پوچھا تو میہما نے کڑی نظروں سے اسے گھورا۔

(واہ۔۔۔ اب بات اپنے میکے والوں کی آئی تو کیسے مین منکائے جارہے ہیں۔ میں تو زبان کھول ہی نہیں سکتا ہاں میری بہن کی شکایتیں سنانے میں یہ چاہے ساری رات گزار دے۔)

”انہوں نے آنے کی خبر دینے کے لیے نہیں، بلاوے کا فون کیا ہے۔“

”تو اس میں منہ لٹکانے والی کون سی بات ہے۔ ایسے بلاؤں پہ تو تم دھمال ڈالتی پھرتی ہو۔ ہاں اگر گرمی کی وجہ سے ملتان جانے کو جی نہیں چاہ رہا تو منع کرو۔“

”کیسے منع کروں، جانا تو پڑے گا۔ مزنی کے بیٹے کا عقیدہ ہے۔“ یہ خبر اس نے اور بھی منہ لٹا کر کہی حالانکہ مزنی اس کی چھوٹی بہن تھی اور اس کے ہاں شادی کے چھ سال بعد بچہ ہوا تھا جس کی میہما کو بھی خوشی تھی۔

”مسئلہ تو یہ ہے کہ عقیدہ ہے۔ کوئی ایسا ویسا فنکشن نہیں اور وہ بھی اس کے پہلے پہلے بیٹے کا۔ نقد رقم کے علاوہ مٹھائی، اس کا اور اس کے شوہر کا، ساس کا جوڑا بھی لے جانا پڑے گا۔ ملتان آنے جانے کا خرچہ الگ۔“

”ہاں مسئلہ تو ہے مگر میں اب کیا کہہ سکتا ہوں۔ تمہارا میکہ ہے، جانے یا نہ جانے کا، دینے یا نہ دینے کا فیصلہ سراسر تمہارا اپنا ہے۔“ وہ شانے اچکا کے لا تعلق بن گیا۔

(دیکھتا ہوں کیسے نہیں جاتیں تمہے سر کے بل چل کے جاؤ گی۔ آخر تمہاری بہن کا معاملہ ہے۔ ہوتا اگر میرے کسی بہن بھائی کا معاملہ، تو اس وقت تمہاری تقریریں نشر ہو رہی ہوتیں۔ پہلے تو بھری گرمیوں میں ایسے چوہچلے کرنے پہ سو سولواتیں سنائی جاتیں۔ پھر فضول رسموں پہ تنقید ہوتی۔)

”ہاں ظاہر ہے تمہارا کیا تعلق؟“ میہا اس کے اس انداز پر تڑخ کے بولی۔

”ظاہر ہے میرے میکے کی بات ہے، تمہارا اس سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ یہ تو میرا مسئلہ ہے صرف اور صرف میرا۔“

(تمہاری بہن آئے تو مجھ پر خرچ کرنا لازم۔ میری مہمان جو ٹھہری اور خاتون خانہ ہونے کے ناتے ساری مہمان نوازی میرا فرض۔ تب تمہارے سارے مسئلے میرے ہو جاتے ہیں۔) وہ آنسو پیتی کروٹ بدل کے دوبارہ لیٹ گئی۔

”پھر کیا ارادہ ہے؟ کیا سوچا ہے تم نے؟“ اس نے کریدا۔

”جانا تو پڑے گا۔ اپنی ناک تو نہیں کٹوا سکتی۔ بچے گھر پہ ہی رہیں گے۔ وہاں سخت گرمی ہے۔ کل تم آفس جلدی بند کر دینا ماسی تب تک بچوں کا دھیان کر لے گی اور پرسوں تو اتوار ہے۔ تم گھر پہ ہی ہو گے۔ میری کل کی ٹکٹ کروا دینا، پرسوں رات یا پیر کی صبح تک آ جاؤں گی اور آج شام کو میرے پیسے بھی واپس کروینا پلیز۔“

”کون سے پیسے؟“

”وہی جو تم نے ادھار کے نام پہ لیے تھے۔“ وہ چمک کے بولی۔

”پہلے چار ہزار اور بعد میں جو ناہید باجی کے آنے پہ خرچا ہوا وہ الگ۔ کل ملا کے سات ہزار بنتا ہے۔“

”کل تک سات ہزار کا ملنا تو بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ ہاں یہ کر سکتا ہوں کہ تمہارے ملتان سے واپس آنے کے بعد تقریباً آدھی رقم واپس کرنے کی کوشش کروں گا۔“

”تب میں کیا کروں گی اس آدھی رقم کا۔“ وہ ایک بار پھر رو پڑی۔

”ایک تو تمہارے آنسو۔“ اس نے وال کلاک کی جانب نظر ڈالی۔ صبح کے سوا سات بجے تھے۔ وہ عموماً نوبت تک جاگا کرتا اور دس بجے آفس روانہ ہوتا۔ آج مہمانوں کو اسٹیشن پہنچانے کے لیے جلدی جاگنا پڑا

اس لیے طبیعت میں کسٹندی تھی۔ سوچا تھا گھر پہنچ کر ایک ڈیڑھ گھنٹے کی نیند لے لے گا مگر اب یہ سارا پروگرام یقیناً میہا کی ناراضی دور کرنے کی نذر ہونے والا تھا۔

(بس یہ ایک چیز ہے تمہارے پاس وافر تعداد میں۔ ورنہ تو شکل، عقل، دل ہر معاملے میں ہاتھ تنگ ہے۔)

”پلیز میہا! صبح صبح میرا دل برا مت کرو اپنے رونے سے۔ پتا ہے میرا سارا دن برا گزرے گا۔ اور تمہارے آنسو سارا دن میرے دل پہ گرتے رہیں گے۔“

اس نے جمائیاں روک روک کے بمشکل ڈائیلاگ مکمل کیا۔ دوسری جانب کروٹ لیے آنسو پونچھتی میہا سوچ رہی تھی۔

(بس یہ ایک چیز ہے تمہارے پاس وافر تعداد میں۔ کھوکھلے ڈائیلاگ۔ نوٹشکی۔ ورنہ تو۔)



3 جولائی۔

اتوار کا دن۔ یعنی چھٹی کا دن۔

اور وہ بھی اگر تین بچوں کو سنبھالنے میں گزر جائے تو کسی مرد کے لیے اس سے برا چھٹی کا دن کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

کل بھی اسے بچوں کی وجہ سے جلدی گھر آنا پڑا۔ میہا صبح دس بجے والی کوچ سے جا چکی تھی۔ ماسی کو اس نے اضافی رقم دے کر شام تک بچوں کے پاس رکھنے کے لیے آمادہ کر لیا تھا۔ دو دن کا کھانا بھی تیار کر کے فریج میں رکھ دیا تھا اور رامش کو خاص تاکید کی تھی کہ وہ ہر حال میں تین چار بجے تک گھر پہنچ جائے کیونکہ ماسی نے صاف اعلان کیا تھا کہ وہ چار بجے کے بعد رکنے پر تیار نہیں اور کوئی آئے یا نہ آئے وہ گھر چلی جائے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے رامش کو بھی یاد دہانی کرائی تھی کہ واپس آنے پہ اسے قرض کی رقم کی پہلی قسط چاہیے اسی وجہ سے ہفتے کا دن اس نے بھرپور

دباؤ میں گزارا۔

جانے کی بھی جلدی۔ نمٹانے کی بھی۔ اور
کمانے کی بھی۔

امید تو نہیں تھی مگر معجزاتی طور پر ایک غیر متوقع
ڈیل فائنل ہو گئی جس کی کمیشن کے طور پر اسے چند
ہزار مل گئے۔ دو ہزار پہلی قسط کے طور پر میسہا کو دینے
کے لیے الگ اور باقی سے گروسری لسٹ کی وہ ساری
شاپنگ کر ڈالی جو میسہا لکھ کے سائڈ نیبل پر رکھ گئی
تھی۔ اپنی کارکردگی سے وہ اب تک خاصا مطمئن تھا۔
کیونکہ ماسی تو اس کے لیے دروازہ کھولتے ہی شکر ادا
کرتی رفو چکر ہو گئی تھی۔ اس نے نہ صرف شام کی
چائے خود بنائی بلکہ رونا کو نہانے پر بھی آمادہ کیا جو ماں
کی غیر موجودگی کی وجہ سے گندی سندی پھر رہی تھی۔
نمرہ اور احمد دونوں کو اپنی نگرانی میں چھٹیوں کا ہوم ورک
کرایا اس کے بعد بغیر کچھ بھولے ساری بور ترین
چیزیں۔۔۔ والیس، مسالہ جات، زودھ، پتی، چاول وغیرہ
خریدے۔ گھر آکر اس نے نمرہ کے ساتھ نیبل پہ کھانا
لگانا چاہا۔

”دوبہر کو ہم نے سینڈویچ کھائے تھے، ماما بنا گئی
تھیں مگر ماسی نے ہمیں ایک ایک ہی کھانے کو دیا
حالانکہ ماما تین تین بنا کر گئی تھیں۔ باقی وہ خود کھا گئی۔“
”دبلاؤ، کوئی بات نہیں، اسے بھی تو کچھ نہ کچھ کھانا
تھا۔“ وہ راتے کا ڈونگا چیک کرنے کے بعد اب فریج
میں رکھی چھوٹی سی ریگیجی کا جائزہ لے رہا تھا۔

”مگر ماما اس کے لیے براٹھا اور رات کا سالن بھی
تو رکھ گئی تھیں اور وہ بار بار کبھی شرموت، کبھی لسی بنا کر پی
رہی تھی۔ اور پاپا، اس میں بریانی ہے، ماما آج رات کے
لیے بنا گئی ہیں۔ اس پلاسٹک کے برتن میں کوفتوں کا
سالن کل دوبہر کے لیے ہے۔“

”بریانی؟ گردن اور ریگیجی کی بریانی؟“ رامش نے
الٹ پلٹ کر کے دیکھتے ہوئے کہا۔ یقیناً ماسی آدھی
ریگیجی الٹ کے ساتھ لے گئی تھی اور تقریباً سارا
چکن بھی۔ احتیاطاً اس نے کل کے لیے رکھے سالن
کو چیک کیا۔ آلو کوفتے کے سالن میں اب شور بے

میں آلو ہی آلو ڈوبے نظر آرہے تھے، آلو کا کوفتہ حیران
پڑا تھا۔ بچوں نے ایسی اجڑی ہوئی بریانی کھانے سے
صاف انکار کر دیا۔ رامش کا اپنا دل بھی برا ہو رہا تھا۔
(خود تو میکے میں دعوتیں اڑا رہی ہوگی، ہمارے لیے
یہ خالی ویران بریانی ہی رہ گئی ہے؟)

وہ احتجاجاً ”بچوں کو لے کر کے ایف سی چلا گیا اور
چارپانچ سواڑا کے واپس آیا۔ پیسے خرچ تو کر لیے مگر بعد
میں اس عیاشی پر تاسف کرتے کرتے نیند نہ آئی۔ صبح
بڑی بو بھل، گرم اور بور تھی۔ اس پہ ناشتہ بنانا، کمرہ
درست کرنا وغیرہ وغیرہ۔ اگرچہ نمرہ مقدور بھر مدد کرتی
رہی۔ دوپہر کو کھانے کا مسئلہ پھر برقرار تھا لیکن اب
رامش نے جذباتی ہونا مناسب نہ سمجھا اور بچوں کو اور
اپنے دل کو بھی ڈانٹ ڈپٹ کے یہی سالن کھانے پر
آمادہ کیا۔

شام کو اس کی حالت ویسی ہی تھی جیسی ان نوبیا ہوتا
بیویوں کی ہوتی ہے جن کے شوہر شادی کے بعد ہفتہ
دس دن کی چھٹیاں ختم ہونے پر پہلی بار آفس جاتے
ہیں۔ شادی کے بعد جن کا ہاتھ پہلی بار کھیر میں ڈلوایا
جاتا ہے۔ وہ بیویاں جس بے قراری سے اور جوش کے
ساتھ شام ہوتے ہی اپنے میاں جی کی گھر واپسی کا
انتظار شروع کر دیتی ہیں تاکہ اسے اپنے سارے دن کی
کارکردگی سنا کر متاثر کریں۔ ساتھ ساتھ ساس نندوں
کے بدلے رویوں کا دبا دبا سا گلہ بھی کریں۔ ٹھیک اسی
طرح رامش بھی بے چینی سے لاؤنج کے چکر کاٹ رہا
تھا۔ اس کے دل میں بھی اپنی کارگزاری اور کارنامے
اہل رہے تھے کہ کس طرح کل سے اس نے تن تنہا
بچوں اور گھر کو سنبھالا ہوا تھا ایسے ہی بچوں کی شرارتیں
اور ماسی کی خباثت کی شکایتیں بھی دل میں مچل رہی
تھیں۔ میسہا نے شام سات بجے والی کوچ سے پہنچنا تھا
اور اس نے رامش کو آنے سے منع کر دیا تھا کہ وہ بچوں
کو اکیلا گھر پر نہ چھوڑے وہ خود ہی رکشہ کر کے گھر پہنچ
جائے گی۔

لیکن رامش اس وقت بتینوں کو کمرے میں اکیلے
دنگل کرتا چھوڑ کے خود لاؤنج میں ٹھل رہا تھا۔ چونکا

نہیں ہوا۔“ وہ اس کے ہاتھ سہلاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

کچھ دیر بعد رامش کی واپسی بھی ہو گئی۔ رونا جواب تک سسک رہی تھی، ماں کو سامنے پا کر نئے سرے سے بھاں بھاپ کر کے رونے لگی۔ اس کی ٹھوڑی پہ ڈرینگ ہوئی تھی۔

”کیا ہوا رامش! زیادہ چوٹ تو نہیں لگی اسے؟“ وہ رونا کو بازوؤں میں بٹھپے دیوانہ وار چوم رہی تھی۔

”نہیں اللہ کا شکر ہے، بچت ہو گئی۔ مجھے ڈر تھا کہ دانت ٹوٹے ہوں گے مگر وہ بھی بچ گئے۔ صرف ٹھوڑی پہ ایک ٹانکا لگا ہے۔“

”تو بھائی صاحب! اتنی دیر کیسے ہو گئی؟“ مسز ملک نے پوچھا۔

”ہاں ہاسپٹل تو نزدیک ہی ہے، بمشکل پانچ منٹ کا راستہ ہے بائیک پہ؟“ میہیا کو بھی خیال آیا۔

”موٹروے پہ کوئی شدید قسم کا روڈ ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ ایمر جنسی میں اس وقت زخمیوں کی تعداد اتنی تھی کہ کوئی اس بجی کی جانب دیکھنے پہ تیار ہی نہ تھا۔ دس پندرہ منٹ انتظار کرنے کے بعد میں وہاں سے نکلا۔ رونا بھی اس چیخ و پکار سے خوفزدہ ہو رہی تھی۔ آگے

ایک پرائیویٹ ہاسپٹل لے جانا بڑا اور پرائیویٹ ہاسپٹل کا حال تو تم جانتی ہو۔ کوئی اندر گھس جائے تو ہر حیلے بہانے سے اس کی کھال کھینچ کر ہی واپس بھجتے ہیں۔ گورنمنٹ ہاسپٹلز میں عوام کو یہ گلہ رہتا ہے کہ وہاں توجہ نہیں ملتی تو یہاں اس بات کا رونا ہے کہ حد سے زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ اب رونا کو ہی دیکھ لو، معمولی چوٹ ہے مگر اتنے ٹیسٹوں، ایکس رے وغیرہ۔ ایک لمبے پروسیس سے گزرنے کے بعد یہ

ایک ٹانکا لگایا گیا۔“

”دچلو شکر ہے بچی کو زیادہ چوٹ نہیں لگی۔“ مسز ملک یہ کہتے ہوئے نیچے اتریں تو میہیا نے رامش کی کوفت اور بے زاری کی اصل وجہ جاننا چاہی۔

”بتایا تو ہے کہ اس ہاسپٹل میں کس کس طرح سے پیسے نکلائے گئے ہیں۔ تین طرح کے ٹیسٹ اور ایک

تب جب کمرے سے آتے قمقمے چیخوں میں بدلے۔ گھبرا کر وہ اندر لپکا تو رونا کو زمین پہ گرے دیکھ کے اس کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ اس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ نمرہ اور احمر کو ایک ایک تھپڑ رسید کرنے کے بعد وہ رونا کو بازوؤں میں اٹھا کے نیچے بھاگا۔ نیچے کے پورشن میں رہنے والے ملک صاحب کے بیٹے کو ساتھ لیا تاکہ وہ بائیک چلائے۔ ان کی بیگم سے اوپر جا کے بچوں کا دھیان رکھنے کی درخواست کی۔

میہیا ساڑھے سات کے قریب گھر پہنچی تو تھکن اور گرمی سے اس کا برا حال تھا۔ دل چاہ رہا تھا گھر جاتے ہی شاور لے کر اے سی آن کر کے بسی تان کر سو جائے لیکن یہ بھی جانتی تھی کہ ایسا کرنا فی الحال ممکن نہیں ہوگا۔ اس کی غیر موجودگی میں رامش نے کسی نہ کسی طرح بے شک کام چلا لیا ہو گا مگر اس کے آنے کے بعد وہ قطعی طور پہ کسی قسم کی رعایت دینے پہ تیار نہ ہوگا۔ گھر پہنچتے ہی آوندھے سیدھے کاموں کا ایک ڈھیر اس کا منتظر ہوگا۔ بیڈروم اور لاونج کی بے ترتیبی۔ بچن میں گندے برتنوں کا ڈھیر۔ ان سب کا تصور اسے اور بھی کوفت میں مبتلا کر رہا تھا مگر یہ نہ جانتی تھی کہ صورتحال اس سے کہیں برہہ کر تشویش ناک ہوگی۔

رامش کی غیر موجودگی۔

نمرہ کے آنسو۔

احمر کا تراچہ۔

اور نیچے والی مسز ملک کی موجودگی۔ ان سب نے اسے ان گنت وسوسوں میں مبتلا کر دیا، وہ تو کوئی سوال تک کرنے کے قابل نہ رہی۔ وہیں ہاتھ پیر چھوڑ کے بیٹھ گئی۔ مسز ملک نے اسے ٹھنڈا اسکوالتش پلاتے ہوئے رساں سے بتایا۔

”فکر کی کوئی بات نہیں۔ نیچے ہیں کھینے کے دوران ایسی چھوٹی مولی چوٹیں لگنا تو معمولی بات ہے۔ رضا ساتھ گیا ہے۔ ابھی تمہارے میاں رونا کو لے کے آتے ہوں گے۔ تم خود دیکھ لینا، انشاء اللہ بھلی چنگی ہوگی۔ میں نے خود ہاتھ پیر سب چیک کیے تھے، صرف دانت ٹوٹے ہیں، اللہ کا کرم ہے کوئی فریکچر وغیرہ

ایکس رے کروانے میں بارہ سو ایمرجنسی ٹریٹ منٹ
کا ساڑھے پانچ سو اور میڈیسن کابل چار سو اسی روپے
بنا ہے۔ اور یہ پیسے۔ یہ پیسے دراصل میں نے تمہیں
لوٹانے کے لیے الگ سے رکھے تھے۔

آخری بات اس نے ڈرتے ڈرتے کہی اور میہا کا
رو عمل جاننے کے لیے اس کا چہرہ دیکھنا چاہا۔ وہ لب
بہینچے بیٹھی تھی۔

”تو پھر منہ تو مجھے لٹکانا چاہیے، تم کیوں لٹکارہے
ہو؟“ وہ بولی۔

”اور میں اس لیے نہیں لٹکارہی کہ مزید گنجائش ہی
نہیں ہے۔ مرے کو سو درے لگ بھی جائیں تو اسے
کیا فرق پڑتا ہے۔“

(میرے دل سے تو اب تک اس غصے میں ہنگامی
شرکت کا غم نہیں کم ہو رہا۔ پہلے سے پتا ہوتا تو میں
خرچے میں سے کچھ کوئی کر کے رکھتی، کوئی نہ کوئی اور
بندوبست کر لیتی لیکن اب جلدی میں ساری شاپنگ
کرنی پڑی۔ نقد ہزار روپیہ دینے کے علاوہ چار سو روپے
کی مٹھالی، منی اور اس کے شوہر کے کپڑے ہزار
روپے میں آئے۔ سوچا تھا اس کی سراس کو گھر سے کوئی
سوٹ نکال دوں گی۔ مگر گھر میں رکھے سارے ان سارے
سوٹ خاصے قیمتی تھے مجبوراً ”ساڑھے تین سو اس پہ
بھی لگانے پڑے۔ بے شک تمہیں میں نے اس
خرچے کا نصف ہی بتایا ہے لیکن ہائے میرے وہ پیسے جو
میں نے بچوں کو مری لے جانے کے لیے الگ کر
رکھے تھے۔ وہ اب مجھے نہیں مل سکتے، کبھی بھی نہیں
جو تم نے لیے ہیں، ان کو وصولنا مجھے بخوبی آتا ہے،
چاہے دیر سے سسی، قسطوں میں ہی سسی مل تو جائیں
گے مگر یہ والے۔ ہائے۔)



”5 جولائی“

کل کا سارا دن عجیب بے لطف گزارا۔ نہ رامش کا
آفس میں کام کے دوران جی لگانہ میہا کو گھر میں
سکون۔ رمنچوٹ کی وجہ سے چڑچڑی ہو رہی تھی۔

سارا دن ہی ریں ریں کرتی رہی۔
نمرہ اور احمر کا سراسکول نوبہجے سے بارہ بجے تک
ہوتا تھا۔ انہوں نے آتے ہی خوشخبری یہ سنائی کہ
اسکول والوں نے جو سمرکیمپ پندرہ جولائی تک جاری
رکھنے کا فیصلہ کیا تھا وہ شدید گرمی اور بچوں کے والدین
کے پر زور اصرار کے باعث پانچ جولائی تک ہی ختم کر دیا
گیا ہے یعنی کل سے مکمل چھٹی۔

”اب ہمیں مری جانے کے لیے مزید ایک ہفتہ
انتظار بھی نہیں کرنا پڑے گا۔“ احمر نے خوشی سے بے
حال ہوتے ہوئے کہا۔

”بیبا آفس سے آئیں گے تو ہم ان سے کہہ دیں
گے کہ ہمیں کل یا پرسوں ہی مری لے جائیں۔“ نمرہ
نے بھی فیصلہ سنا دیا۔ میہا بلاوجہ انہیں شور مچانے پر
ڈانٹنے لگی۔ ایک تو ابھی تک پانی کا مسئلہ حل نہ ہوا
تھا اور سے ان بچوں نے ایک نئی ضد ان کے سروں پہ
سوار کرنے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ آج صبح آنکھ کھلتے ہی
اس نے حسب معمول پانی والی موٹر کاٹن دباننا چاہا تو اس
کی مخصوص گھرر گھرر والی آواز سنائی نہ دی۔ نیچے
اتر کے دیکھا تو موٹر میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ رامش
جانے سے پہلے الیکٹریشن کو بلا لایا۔ جو ”مریضہ“ کو
اپنے ساتھ ”کلینک“ لے گیا۔ تب سے اب تک وہ
رات کے بھرے ہوئے ٹب میں سے ضرورت کے
مطابق تھوڑا تھوڑا پانی لے کر استعمال کر رہی تھی۔

”مجھے شاور لینا ہے۔“ پسینے سے ترا حمر اپنی ٹی
شرٹ اتار رہا تھا۔

”پانی نہیں آرہا صبح سے۔ ٹب میں تھوڑا بہت رکھا
ہے۔ دونوں جا کے منہ ہاتھ دھولو اور احتیاط سے خبردار
جو پانی ضائع کیا تو۔“

”اتنی گرمی ہے۔“ وہ چیخا۔

”اور کیا، اب ہم شاور بھی نہیں لے سکتے؟۔“
دونوں احتجاج کر رہے تھے اس سے پہلے کہ گرمی کے
ذکرہ انہیں ایک بار پھر مری جانا یاد آجاتا وہ کمرے سے
نکل گئی۔ الیکٹریشن کا نمبر ملا کر اس کی سستی پہ چار
باتیں سنائیں، ساتھ ساتھ گرمی اور پانی کی غیر موجودگی

کی وجہ سے بچوں کی حالت کا نقشہ کھینچ کے اس کا دل موم کرنے کی کوشش کی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر وہ آپہنچا۔

”بی بی جی! موٹر تو بری طرح جل گئی ہے۔ دو دن لگا کے میں نے ٹھیک بھی کی تو چار سو روپے خرچہ آئے گا، گاڑی پھر بھی کوئی نہیں۔ ہو سکتا ہے دو دن بعد پھر یہی مسئلہ ہو۔ نئی موٹر ساڑھے سات سو کی آتی ہے۔ میں اپنے واقف کار سے چھ سو روپے کی لے دیتا ہوں۔ کم از کم ایک سال کی گاڑی تو ہوگی۔“

”باقی کے پیسے صاحب سے شام کو آکر لے لینا۔ اپنی جانب سے تو اس نے عقل مندی کا ثبوت دیا تھا مگر رامش سنتے ہی بگڑ گیا۔

”اس نے کہا اور تم نے مان لیا۔ آرام سے پکڑا لے اسے پانچ سو نئی موٹر کے لیے حالانکہ یہ والی بھی ابھی پچھلے سال لگوائی تھی۔“

”لیکن اس کی خرابی دور کرنے میں بھی تقریباً اتنے ہی پیسے لگ رہے تھے ورنہ مجھے کوئی شوق تو نہیں تھا۔“

”ان لوگوں کی تو عادت ہوتی ہے بات کو بڑھا چڑھا کے بیان کرنے کی۔ میں کسی اور کو دکھانا، پچاس یا سو روپے میں مسئلہ حل ہو جاتا۔ تمہیں تو ہر بات کی جلدی ہوتی ہے۔“

”جلدی؟ صبح سے دوپہر ہونے کو آئی تھی گھر میں پانی کا ایک قطرہ تک نہ تھا اور تم مجھے ہی الزام دے رہے ہو۔“

حسب توقع اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ رات کا کھانا بھی اس نے بے حد خاموشی سے لگایا۔ بچوں نے کھانے کے دوران رامش کو بھی سمر اسکول ختم ہونے کی اطلاع دی۔

”اب ہم اس ہفتے مری جا سکیں گے نا پاپا؟“
رامش نے چونک کر مہیہا کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ فوری طور پر وہ فیصلہ نہ کر پایا کہ بچوں کو کیا جواب دے۔ اس نے پھی خاموشی کی وہی بگل ماری جو وہ اوڑھے ہوئے تھی۔

رات کو بھی کتنی دیر تک وہ چینل بدل بدل کے اس کا انتظار کرتا رہا جو بچوں کے کمرے میں نجانے کیا کر رہی تھی۔

”یقیناً نہیں بہلا رہی ہوگی۔“

اس نے قیاس کیا اور مایوس ہو کے سونے کی تیاری کرنے لگا۔ اسی وقت وہ اندر آئی اور اپنے معمول کے مطابق ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کے چہرے کے ساتھ کوئی کارروائی کرنے لگی۔

(اس چیز کی قضا نہیں ہو سکتی دنیا چاہے ادھر کی ادھر ہو جائے۔۔۔) اس نے جل کے سوچا۔

(میں پریشانی سے گھل رہی ہوں اور ادھر بے فکری کا یہ عالم ہے کہ میوزک چینل پہ ”ساقی ساقی“ سنا جا رہا ہے بلکہ دیکھ کر آنکھیں سینکی جا رہی ہیں۔) اس نے غصے سے چہرے پہ شور کڑا۔ اور دھپ دھپ کرتی بیڈ کی جانب آئی۔ زور سے اپنا تکیہ گھسیٹا اور دھڑام سے خود کو بستر پر گرالیا۔ کچھ دیر بعد رامش کو اس کی سسکیاں سنائی دیں۔

”مہیہا!“

”پلیز رامش! مجھ سے کچھ مت کہنا۔ کم از کم کوئی بری خبر مت سنانا اور نہ ہی یہ کہنا کہ مجھے بچوں کا دھیان کس طرح مری کے ٹرپ سے ہٹانا ہے۔ یہ کام میں نہیں کر سکتی۔ بالکل بھی نہیں کر سکتی۔“

وہ ٹھنڈا ہو کے پرے ہٹ گیا۔ جس سے ثابت ہوا وہ کچھ ایسی ہی بات کرنے والا تھا۔ کچھ دیر تک خالی خالی نظروں سے تجارتی خبریں سنانے والی بنی سنوری اسمارٹ سی نیوز ریڈر کو دیکھتے رہنے کے بعد اس نے تکیہ درست کر کے سونے کا ارادہ کیا مگر مہیہا کی دلی دلی سسکیاں اسے ایسا کرنے نہ دے رہی تھیں۔ جلتے بھنتے اس نے وال کلاک پہ نظر ڈالی۔

”ساڑھے گیارہ۔۔۔“

اگرچہ رات اتنی بھی نہ ہوئی تھی مگر جب جاگ کر ایسی ہی صورت حال کا سامنا کرنا ہو مسئلہ در مسئلہ الجھنا ہو تو اس سے بہتر یہی لگتا ہے کہ آنکھیں موند کے غافل ہو جایا جائے۔

(مگر میں بد نصیب تو یہ بھی نہیں کر سکتا۔ ایک تو اس کو ہمیشہ روٹھنے منانے کے لیے آدھی رات کا وقت ملتا ہے۔

”یار میہا! تم اتنی جلد ہمت ہارنے والی لگتی تو نہیں ہو۔ اتنے سالوں تک ہر برے بھلے وقت میں اتنے حوصلے سے میرا ساتھ نبھاتی رہی ہو پھر اب یہ کم حوصلگی کس لیے؟“

”جو دور ہم لوگوں نے شادی کے بعد دیکھا یعنی باقاعدہ پریکٹیکل لائف میں آنے کے بعد اس تجربے سے ہم اپنے بچوں کو اتنی سی عمر میں کس طرح آگاہ کریں اور کیوں کریں؟ کیوں ابھی سے انہیں حقیقتوں سے روشناس کرایا جائے۔؟ اور کیوں انہیں بھی مجبوریوں، مصالحتوں سے متعارف کرایا جائے؟“

اس سوال نے رامش کو بھی سوچ میں ڈال دیا۔ اسے اپنا بچپن یاد آنے لگا۔ وہ کم عمری میں یتیم ہو گیا تھا۔ مالی حالات بھی خاص اچھے نہ تھے اس کے باوجود اسے یاد نہیں تھا کہ کسی بڑی محرومی نے اس کے بچپن کی معصومیت بے فکری اور لالباہی میں کو نقصان پہنچایا ہو۔ اس کی آنکھوں میں اپنے بچوں کے چہرے گھومنے لگے۔ وہ چہرے جو چند دن سے ایک من چاہی تفریح کے تصور سے ہی دکھنے لگے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید سنجیدہ اور رنجیدہ ہوتا اس کی نظر ایک بار پھر کلاک کی جانب گئی۔

”گیارہ بج کر پچاس منٹ۔“

گھڑی کی سوئیاں جیسے جیسے آگے پڑھتی تھیں، نیند بھی اسی رفتار سے اس پہ غلبہ پاتی تھی۔ اب تو جیسے آنکھوں میں مزچیں سی بھرنے لگی تھیں۔

(سارا فلسفہ رات کو یاد آتا ہے۔ سارے آنسو بھی رات کو نکلتے ہیں۔ اور تو اور بھولے بھٹکے کوئی عقل والی بات بھی رات کو ہی منہ سے نکلتی ہے اور ادھر یہ حال ہے کہ دو منٹ مزید آنکھیں کھلی رکھنا محال ہے۔)

دانت کچکچاتے ہوئے اس نے میہا کے بال سہلائے۔

”اللہ بہتر کرے گا۔ کیوں بے کار کی سوچوں میں اپنا

جی جلاتی ہو۔ اب نہ سہی، کچھ ہفتے بعد سہی، تب بھی نہیں تو اگلے سال سہی، دل کو بہلانا دیکھو میہا!“

(وہ تو تم سے شادی کے بعد سے کر رہی ہوں۔)

میہا نے پلٹ کر خفگی سے اسے دیکھا۔ رامش نے سنبھل کر پھر سے پینٹر ابدلا۔

”میں تمہاری صحت کے خیال سے کہہ رہا تھا۔ دیکھو ناں، پچھلے کچھ دنوں سے کتنا دباؤ رہا ہے تم پہ۔ کام کا بھی اور ذہنی بھی بالکل مرجھا کے رہ گئی ہو۔ (اللہ معاف کرے، کیا کیا کہنا پڑتا ہے۔)

”پریشانیاں تو زندگی کے ساتھ ساتھ ہی چلتی ہیں۔ فی الحال ان سب کو برے جھٹکو اور ذہن کو ہلکا پھلکا کر کے سونے کی کوشش کرو۔ صبح نکالتے ہیں اس کا کوئی حل۔ دیکھو ناں، رات کے بارہ بج گئے ہیں، اگلا دن۔۔۔“ اچانک وہ رک گیا۔ اس کی نظریں گھڑی پہ جمی رہ گئیں۔

(ہاں، نکل چکا تم سے حل صرف مسئلے پیدا کر سکتے ہو وہ بھی دھڑا دھڑا ان کا حل تو۔۔۔)

اس نے رامش کو دیکھا جو اب کلاک سے نظریں ہٹا کر کیلنڈر کو تک رہا تھا۔ میہا کے دل کی بھڑاس ادھوری رہ گئی۔

”اگلا دن شروع ہو گیا ہے میہا!“ بالآخر رامش بولا۔

”ہاں، چھ جولائی۔“ اس کے روئے چہرے پہ مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

ابھی اپنی اور سری۔ رامش نے بازو آگے بڑھا کر اسے اپنے نزدیک کیا اور اس کے ماتھے کو ہونٹوں سے چھوتے ہوئے وش کیا۔

”زندگی کے دس قیمتی سال میرے ساتھ ہر اچھے برے وقت میں گزارنے کا شکریہ میری جان!“

”اور تمہیں بھی اپنی زندگی کے دس قیمتی سال میرے ساتھ ثابت قدمی اور تحمل کے ساتھ گزار لینے پہ بہت بہت مبارک۔“

”دیکھ لو، اس بار اپنی اور سری سب سے پہلے مجھے یاد آئی۔ ہمیشہ تم مجھے یہ طعنہ دیا کرتی تھیں۔ اس بار یہ گلہ

بھی دور کر دیا۔“

”وہ تو میں اپنی پریشانیوں میں الجھی ہوئی تھی اس لیے وقتی طور پر ذہن سے نکل گیا ورنہ یہ کوئی بھولنے والی بات ہے۔ اور تمہیں بھی تو کیلنڈر دیکھ کے یاد آئی ہے ہماری شادی کی دسویں سالگرہ۔“

”جی نہیں، مجھے پہلے سے یاد ہے۔“

”جھوٹ۔“ وہ ماننے پہ تیار نہ تھی کیونکہ رامش کا سابقہ ریکارڈ اس معاملے میں اچھا نہ تھا۔

”اچھا جی۔۔۔! وہ کیسے؟“

”وہ ایسے۔۔۔“ اس نے جیب سے ایک کارڈ نکالا۔

”یہ کارڈ دیکھ رہی ہو۔ یہ لبرٹی کی مشہور چپولرز شاپ کا ہے جہاں میں نے اس اپنی ور سری پر تمہیں گفٹ کرنے کے لیے بہت خوبصورت بالیاں پسند کی ہیں۔ سوچا تھا کل جا کے لے آؤں گا اور آج ٹھیک بارہ بجے گفٹ کروں گا مگر کل رمناک پریشانی آج پانی کا مسئلہ، گھر آنے کی جلدی تھی۔ اب کل تم میرے ساتھ جا کے خود لے لینا بلکہ اگر کوئی اور ڈیزائن پسند ہو تو وہ لے لینا لیکن یہ دھیان رہے کہ وہ ہو اسی رتج میں دو ڈھائی ہزار میرے پاس تھے اور چار تم سے ادھار لیے تھے۔ چھ ہزار کی بالیاں ہیں مگر میں بہت خوبصورت اور نفیس۔ کہو اب تو مانتی ہونا کہ اس پار میرے ذہن میں شادی کی سالگرہ تم سے پہلے موجود تھی۔“

”کچھ کہنا مشکل ہے۔“ اس نے شانے اچکائے۔

”کیا مطلب؟“

”یعنی یہ کہنا مشکل ہے کہ تمہارے ذہن میں مجھے بالیاں گفٹ کرنے کا خیال پہلے آیا یا میرے ذہن میں تمہیں گفٹ کرنے کا۔ میں نے اس اپنی ور سری پہ تمہارے آفس کے لیے روم از کولر گفٹ کرنے کا سوچا تھا۔ ہر سال تمہاری گرمیاں بس یہ سوچتے ہوئے ہی گزر جاتی ہیں اس لیے کمیٹی کے پندرہ ہزار میں سے میں نے تین ہزار پہلے ہی اس نیت سے الگ کر کے رکھ لیے تھے۔ پندرہ سو پہلے سے میرے پاس پڑے تھے۔“

وہ کھلکھلا کے ہنس دی۔

رامش کے لبوں پہ بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔
”یعنی یہ معاملہ بھی ٹائی ہو گیا۔ اس بار بھی تمہیں شکست دینے کی میری حسرت، حسرت ہی رہ گئی۔“
”حسرتیں تو وجود میں آتی ہی اس لیے ہیں رامش کہ وہ ہمیشہ۔۔۔“

حسرت کے لفظ سے اسے ایک بار پھر یاد آ گیا کہ صبح اسے بچوں کو یہ خبر سنا کر ان کے اترے ہوئے چہرے دیکھنا ہوں گے کہ اس بار بھی وہ گرمیوں کی چھٹیاں گھر پہ گزاریں گے۔ اس بار بھی ان کے ماما پاپا ایسا کوئی بندوبست۔۔۔

”رامش!“ بجلی کی طرح ایک خیال اس کے ذہن میں کوندا تھا۔

”رامش! کیوں نہ ہم۔۔۔“ ابھی وہ اتنا ہی کہہ پائی تھی۔

”ہاں، کیوں نہ ہم۔۔۔“ رامش نے بات مکمل ہونے سے پہلے اس کی تائید کی۔

”جہاں اتنی گرمیاں بغیر کولر کے گزار دیں، یہ ایک اور سہی، کون سا سارا دن گزارنا ہوتا ہے آفس میں۔“
”اور بالیاں تو تم مجھے شادی کی گیارہویں یا بارہویں سالگرہ پہ بھی دے سکتے ہو۔“ اس کی آنکھیں جھلملا گئیں۔

”تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں کیا کہنے والی ہوں؟۔“

”شادی کے دس سال بعد بھی اگر میں تمہارے دل کی بات بغیر کہے نہ جان سکوں تو کیا فائدہ اس ساتھ کا۔“

وہ کہہ رہا تھا اور مہمہ ہا دل ہی دل میں اپنی خود کلامی کنٹرول کرنے کے پروگرام بنا رہی تھی۔ کچھ ایسے ہی ارادے رامش بھی باندھ رہا تھا۔

کیونکہ اگر دونوں اسی طرح ایک دوسرے کے دل کی ساری باتیں جاننے لگے تو۔۔۔